باسمہ تعالیٰ

حضرت مولانا ریاست علی بجنوریؒ

اوران کی کتاب 'شوری کی شرعی حیثیت' کا ایک جائزہ

محمد اللہ خلیلی قاسمی

حضرت مولانا ریاست علی صاحب بجنوری رحمۃ اللہ علیہ ایک جید عالم دین، نکتہ رس محدث، باصلاحیت استاذ، بے مثال ادیب وشاعر اور گوناگوں خوبیوں کے مالک تھے۔تقوی ودیانت داری، رأفت ورحمت، ذکاوت وذہانت، اصابت رائے ومعاملہ سنجی، مہمان نوازی وغریب پروری اور حسن اخلاق و تواضع آپ کی نمایاں خصوصیات تھیں۔آپ کے انتقال سے دارالعلوم کی علمی وفکری تاریخ کا ایک باب بند ہوگیا۔

حضرت مولانا کی تدریسی زندگی پینتالیس برسوں پر محیط ہے۔آپ نے ہزاروں طالبان علوم اسلامیہ کو علوم نبوت کی روشنی سے منور کیا۔آپ کا درس بہت مربوط، عام فہم، سبک رفتار اور مقبول ہوتا تھا۔تدریس کے ساتھ ساتھ ماہنامہ دارالعلوم کی ادارت کی ذمہ داری بھی انجام دی اور شیخ الہند اکیڈمی کے ڈائریکٹر بھی مقرر کیے گئے۔۱۹۸۵ء میں آپ کو مجلس شوریٰ نے مجلس تعلیمی کا ناظم (ناظم تعلیمات) مقرر کیا، اس منصب پر آپ پانچ سال تک فائز رہے۔ دارالعلوم میں آپ کا دور نظامت بہت مثالی تھا۔نازک حالات میں دارالعلوم کے تعلیمی نظام کو سنبھالا دینا اور اسے ترقی کی بلندیوں پر پہنچانا آپ کا تاریخی کارنامہ ہے۔حضرت مہتمم صاحب وغیرہ ذمہ داران کی غیر موجودگی میں اکثر آپ کو قائم مقامی یا نیابت اہتمام کے فرائض انجام دینے پڑتے۔مجلس شوریٰ نے آپ کو مستقل طور پر نائب مہتمم کے عہدہ کی پیشکش کی لیکن انھوں نے معذرت ظاہر کی۔گزشتہ چالیس سالوں کے دوران انھوں نے دارالعلوم کی انتظامیہ کو اپنے صائب مشوروں اور بروقت رہ نمائی سے بڑی طاقت بخشی۔اسی لیے بجا طور پر کہا جاسکتا ہے کہ آپ جدید دارالعلوم کے معماروں میں تھے۔

حضرت مولانا ریاست علی بجنوریؒ کا تصنیفی یادگاریں

تدریسی وانتظامی ذمہ داریوں کے ساتھ آپ نے اہم علمی وتصنیفی سرمایہ بھی چھوڑا۔ایضاح البخاری آپ کے اعلی علمی وادبی ذوق کا شاہ کار ہے اور اردو کی شروح بخاری میں ممتاز حیثیت رکھتی ہے۔آپ نے اصول فقہ کے موضوع پر حضرت مولانا نعمت اللہ اعظمی کے ساتھ مشترکہ طور پر 'تسہیل الاصول' لکھی جو دارالعلوم میں سال چہارم میں داخل درس ہے۔اسی طرح 'مقدمہ تفہیم القرآن کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ' مکتبہ دارالعلوم سے شائع ہوچکی ہے۔

اخیر زمانے میں حضرت مولانا علامہ محمد اعلی التھانوی کی مشہور آفاق کتاب 'کشاف اصطلاحات الفنون' پر مولانا عارف جمیل صاحب مبارک پوری کے ساتھ تحقیقی کام بھی کیا جو پایۂ تکمیل کو پہنچ چکا ہے۔اسی طرح ہونہار شاگردوں کی مدد سے خلاصۃ التفاسیر (مؤلفہ مولانا فتح محمد تائب لکھنوی، متوفی ۱۳۲۷ھ/۱۹۰۹ء) کی تدوین وتحقیق کا کام انجام دیا۔یہ دونوں اہم کتابیں عنقریب منظر عام پر آنے والی ہیں۔

آپ علم وعمل میں بلند مقام پر فائز ہونے کے ساتھ ساتھ شعر وادب میں اعلیٰ ذوق کے حامل تھے جس کا زندہ ثبوت دارالعلوم دیوبند کا شہرۂ آفاق 'ترانہ' ہے جو ایک لازوال ادبی شہہ پارہ کی حیثیت رکھتا ہے۔شاعری میں ظفر تخلص فرماتے تھے۔آپ کا مجموعۂ کلام 'نغمۂ سحر' کے نام سے شائع ہوچکا ہے۔ آپ کا کلام ضخامت اور قامت میں کہتر ہونے کے باوجود قدر وقیمت کے اعتبار سے بہت 'بہتر' ہے۔کوثر وتسنیم سے دھلی ہوئی زبان اور سلیس ورواں کلام کا یہ مختصر مجموعہ بھی آپ کو مستند شعراء کی صف میں شمار کرانے کے لیے کافی ہے۔اسی طرح مولانا محمد عثمان کاشف الہاشمی کا شعری مجموعہ بھی آپ کی کاوشوں سے منظرِ عام پر آیا۔

'شوریٰ کی شرعی حیثیت' شاندار تحقیقی کارنامہ

'شوریٰ کی شرعی حیثیت' حضرت مولانا کی نہایت اہم تصنیف ہے جو اپنے موضوع پر ایسی اچھوتی، بسیط اور مدلل کتاب ہے جس سے کتاب خانے خالی ہیں۔ یہ کتاب اولاً ۱۴۰۸ھ مطابق ۱۹۸۷ء میں حضرات اکابر (حضرت مفتی محمود حسن گنگوہیؒ، حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب بجنوری سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند، حضرت مولانا معراج الحق صاحب سابق صدر المدرسین دارالعلوم دیوبند، حضرت مولانا نصیر احمد خان بلند شہری سابق شیخ الحدیث وصدر المدرسین دارالعلوم دیوبند، حضرت مولانا قاضی اطہر مبارک پوری رحمہم اللہ) کی تقریظات وتصدیقات کے ساتھ شائع ہوئی اور اب بھی مکتبہ دارالعلوم سے شائع ہورہی ہے۔ اس وقت میرے سامنے محرم الحرام ۱۴۳۵ھ مطابق نومبر ۲۰۱۳ء کا ایڈیشن موجود ہے جو چار سو آٹھ (صفحات) پر مشتمل ہے۔

حضرت مولانا کی یہ کتاب مدارس عربیہ کے نظام کار، ان کے دستور اساسی، رجسٹریشن، وقف اور دیگر تمام امور ومعاملات میں شوریٰ کی شرعی حیثیت کی تفصیلات پر مشتمل ہے۔ اس کتاب میں مدارس اسلامیہ کی مجالسِ شوریٰ، اہتمام، مالیت اور جائیداد وغیرہ کے بارے میں شرعی احکام مفصل اور محقق طور پر بیان کیے گئے ہیں۔

دارالعلوم دیوبند میں ۱۹۸۰ء کے بعد مہتمم اور مجلس شوریٰ کے درمیان شدید اختلاف پیدا ہوا، جس کی وجہ سے بعض حلقوں کی طرف سے ایک نیا مسئلہ بڑی شدت کے ساتھ اٹھایا گیا کہ ان مدارس کی مجلس شوریٰ اور ان کے مہتمم کی باہمی حیثیت کیا ہے؟ نیز مدرسہ کے مہتمم اور مدرسہ کی مجلسِ شوریٰ کے درمیان کس نوع کا تعلق ہے، ان میں سے کون حاکم ہے اور کون محکوم، بعض جگہ تو شوریٰ نے مہتمم کو اتنا پابند کردیا ہے کہ وہ کوئی کام شوریٰ سے پوچھے بغیر نہیں کرسکتا، اور نہ شوریٰ اس کے لیے کوئی ضابطہ بناتی ہے کہ جس کے تحت مہتمم کام کرلیا کرے۔ چھوٹی چھوٹی چیزوں میں سخت دشواری پیش آتی ہے۔ بعض جگہ مہتمم نے شوریٰ کو بالکل ہی بے حیثیت کردیا ہے اور خودمختاری کا پورا پورا اعلان کردیا ہے کہ کسی کام میں شوریٰ سے پوچھنے اور معلوم کرنے کی ضرورت نہیں، بلکہ شوریٰ ہی بیکار اور کالعدم ہے۔ دارالعلوم کے اختلاف کے پس منظر میں حضرت مولانا مسیح اللہ خان جلال آبادی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک رسالہ 'رسالۂ اہتمام وشوریٰ' لکھا جس میں مہتمم کو اصل اور شوریٰ کو تابع قرار دیا گیا اور دارالعلوم کے دستور اساسی کو غیر شرعی بتایا گیا۔

چناں چہ دارالعلوم دیوبند نے صورتِ حال کی نزاکت پیش نظر اس موضوع کی تحقیق وتنقیح کے لیے حضرت مولانا کا انتخاب کیا۔ حضرت مولانا نے نہایت تحقیق وتلاش سے ان مسائل پر کتاب وسنت، فقہ وفتاویٰ اور علمائے کرام آراء واقوال کے قدیم وجدید مآخذ کو کھنگال کر نہایت سنجیدہ اور باوقار کتاب مرتب کی۔ مولانا نے موضوع کے متعلق تمام گوشوں کو فقہی عبارات سے مدلل کیا اور ہر جگہ ایسی دل نشیں گفتگو کی ہے کہ مسئلہ پر شرح صدر ہوجاتا ہے۔ کتاب کے مطالعہ سے محسوس ہوتا ہے کہ حضرت مؤلف کو مضامین کی ترتیب اور بسط دلائل میں خصوصی درک حاصل تھا۔ پوری کتاب اتنی متانت اور سنجیدگی سے لکھی گئی ہے کہ کہیں مجادلانہ یا ادعائی حتی کہ مجیبانہ انداز بھی نہیں اپنایا گیا، بلکہ زیر بحث مسئلہ کا صرف معروضی جائزہ لیا گیا۔

اس کتاب میں اولاً مدارس عربیہ کے نظام کار کی تشریح کی گئی ہے اور اکابر کے ارشادات کی روشنی میں یہ واضح کیا گیا ہے مدارس عربیہ کے عہدہ داروں میں کس منصب کی کیا شرعی حیثیت ہے۔ پھر شوریٰ کا شرعی مقام واضح کیا گیا ہے۔ شوری کا مسئلہ چوں کہ اس تحریر کا بنیادی نقطۂ بحث تھا اس لیے اس موضوع کے تمام پہلوؤں کا مبسوط جائزہ لیا گیا ہے اور بتلایا گیا ہے کہ عہد رسالت اور خلافت راشدہ میں شوری کا طرز عمل اور دائرۂ کار کیا تھا۔ پھر قرآن وحدیث اور فقہ اسلامی میں شوری کے لیے پائی جانے والی حقیقتوں کو پیش کیا گیا ہے اور یہ بات پوری طرح واضح اور ثابت کردی گئی ہے کہ مدارسِ عربیہ میں شوریٰ کی بالادستی شبہ سے بالاتر ہے۔ ان خالص علمی اور تحقیقی مضامین کے درمیان، شوری کی بالادستی کا انکار کرنے والے نقطۂ نظر کے دلائل کا بھی پوری سنجیدگی سے جائزہ لیا گیا ہے جس سے غلط فہمیوں کے ازالہ میں پوری مدد ملتی ہے۔ اسی کے ساتھ مدارس کے ستور اساسی اور سوسائٹی ایکٹ کے تحت رجسٹریشن کے مسئلہ کو بھی منقح کیا گیا ہے۔ رجسٹریشن پر کیے جانے والے اعتراضات جائزہ لیا گیا ہے۔

اسی سلسلہ کا دوسرا اہم مسئلہ یہ تھا کہ یہ مدارس فقہائے کرام کی اصطلاح کے مطابق وقف ہیں یا وقف نہیں ہیں۔حضرت مولانا نے اس کتاب میں مسئلۂ وقف کو خوب وضاحت سے بیان کیا ہے کہ کن شرائط کے ساتھ وقف صحیح ہوتا ہے؛ مدرسہ کی ہر چیز کو نہ وقف کہا جاسکتا ہے اور نہ ہر چیز کے وقف ہونے سے انکار کیا جاسکتا ہے۔ جو جائداد وغیرہ فقہی ضابطہ کے تحت وقف ہے اس پر وقف کے احکام لاگو ہوں گے کہ بیع وغیرہ کے ذریعہ اس کی ملکیت کسی کو منتقل نہیں کی جاسکتی اور ان کی حفاظت پوری طرح واجب ہوگی۔لیکن جو اشیاء فقہی قاعدہ کے تحت وقف نہیں، بلکہ ملکِ مدرسہ میں داخل ہیں، ان پر وقف کے احکام نافذ نہیں ہوں گے، البتہ مدرسہ کی ضروریات ان سے پوری کی جائیں گی۔مہتمم یا شوریٰ ایسی کسی چیز کو اپنی ذاتی ملک قرار دینے کا مجاز نہیں۔اس کتاب سے آپ کی فقیہانہ شان نمایاں ہوتی ہے جو عمومی طور پر لوگوں کو پر آشکارا نہیں تھی۔

اس کتاب کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ حضرت مولانا نے اس کتاب کو لکھنے کے بعد حضرت مولانا مفتی محمود حسن گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مولانا معراج الحق صاحب دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ بالاستیعاب پڑھ کر سنائی اور ان حضرات اکابر کے مشوروں کے مطابق اس میں حک و فک کیا۔اس کے بعد اس کتاب کی نقول کو متعدد اہل علم (حضرت مولانا منظور احمد نعمانی و حضرت مولانا قاضی زین العابدین میرٹھی رحمہما اللہ تعالیٰ اراکین مجلس شوری دارالعلوم دیوبند) اور اساتذۂ دارالعلوم (حضرت مولانا نعمت اللہ اعظمی، حضرت مولانا مفتی سعید احمد پالن پوری اور حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی قاسمی مدظلہم العالی) کو پیش کی جس کو ان حضرات نے ملاحظہ فرما کر اپنے نوٹس لکھے۔اس کے بعد مجلسِ مناقشہ منعقد کی گئی اور تبادلۂ خیالات کے بعد اصلاحات کی گئیں۔ حضرت مولانا محمد عثمان کاشف الہاشمی اور حضرت مولانا حکیم عزیز الرحمٰن اعظمی رحمہما اللہ کو بھی اس کتاب کی کاپی پیش کی گئی اور انھوں نے بھی اس پر مکمل اعتماد کا اظہار فرمایا۔حضرت مولانا ریاست علی بجنوری رحمۃ اللہ علیہ نے اس کتاب میں ان تمام حضرات کا ذکر کیا ہے جن سے انھوں نے اس کتاب کی ترتیب کے دوران استفادہ، تبادلۂ خیالات یا اور کسی طرح کی مدد لی، حتی کہ انھوں نے خوردوں کے تعاون کا بھی بہت فراخ دلی کے ساتھ کا اظہار کیا ہے جو آپ کے اعلیٰ اخلاق کی واضح دلیل ہے۔

اس کتاب کی تیاری میں حضرت نے جہاں تفسیر و حدیث اور فقہ اسلامی کے امہات کتب سے استفادہ کیا ہے وہیں کچھ معاصر اور ماضی قریب کے اہل علم کتابوں سے بھی استفادہ کیا ہے جیسے حضرت مولانا عبید اللہ سندھی رحمۃ اللہ علیہ کی 'التمہید لائمۃ التجدید' اور 'مواقف المسترشدین'، شیخ عبدالوہاب خلاف کی 'اصول الفقہ'، شیخ محمد خضری بک کی 'اصول الفقہ' اور 'تاریخ التشریع الإسلامی'، شیخ ابوزہرہ مصری کی 'اصول الفقہ' اور 'تاریخ المذاھب الاسلامیۃ' اور قدیم مآخذ میں 'الأحکام السلطانیۃ' (مؤلفہ شیخ ابوالحسن علی بن حبیب البصری المادروی متوفی ۴۵۰ھ)، 'الأحکام السلطانیۃ' (مؤلفہ قاضی ابویعلی الفراء، متوفی ۴۵۸ھ)، 'الموافقات' اور 'الاعتصام' (شیخ ابواسحاق الشاطبی الغرناطی المتوفی ۷۹۰ھ)، 'جامع الرموز' (مؤلفہ شیخ شمس الدین محمد خراسانی فہستانی متوفی ۹۶۹ھ)، 'کشف الاسرار' (مؤلفہ علامہ عبدالعزیز بخاری متوفی ۷۳۰ھ) وغیرہ۔مراجع کی فہرست میں ۹۵ (پنچانوے) کتابوں کا ذکر موجود ہے۔

شوریٰ کے نظام کی اہمیت اور اس کی عصری معنویت

خیر القرون میں منصب خلافت سے لے کر ماتحت امارتوں تک مناصب کی تقسیم، امور کی تنفیذ و تعمیل کا معاملہ وامرھم شوریٰ بینھم کی اساس پر قائم رہا۔لیکن رفتہ رفتہ یہ بنیاد کمزور ہوتی چلی گئی اور اسلامی حکومت میں شورائیت اور اہلیت کی جگہ وراثت کا عمل جاری ہوگیا۔خیار امت اور علمائے کرام نے روز اول ہی سے اس غلطی کا ادراک کرلیا تھا، انھوں نے اس کی اصلاح کی کوششیں بھی کیں، لیکن اسلامی حکومتیں وراثت کے اثرات سے محفوظ نہ رہ سکیں۔بہرحال علمائے کرام سلاطین کے خلاف کام کرنے کے بجائے شورائیت کے واجبِ کفایہ کو اپنے علم و حکمت کے دبستانوں میں لاگو کیا اور شوریٰ کی بالادستی و سرپرستی کا عمل جاری کیا۔حضرات علمائے کرام نے شوریٰ کی زیر سرکردگی میں علوم و فنون کی جو گراں قدر خدمات انجام دی ہیں وہ اسلامی کتب خانہ کی صورت میں موجود ہیں۔ جہاں جہاں اسلامی حکومتیں قائم رہیں علمائے کرام اپنی پسندیدہ روش پر قائم رہے، انھوں نے سلاطین سے کوئی سروکار نہیں رکھا اور شوریٰ کے ذریعہ

کتاب وسنت کی طرف مراجعت کر کے غیر منصوص مسائل کے شرعی احکام کو مدون کرتے گئے اور علوم اسلامیہ کا ایک قابل قدر ذخیرہ جمع کر دیا۔

ہندوستان میں مسلم حکومت کی تحلیل کے بعد جب مدارس اور دینی مراکز سے اقتدار اسلامی کی سرپرستی ختم ہوگئی تو انھوں نے ملت اسلامیہ کی بقاوتحفظ کی خاطر مدارس اسلامیہ کا نظام مرتب کیا۔ اکابرین نے اس نظام کو شوریٰ کی بنیادوں پر استوار کیا۔ یہ دیدہ ور اور ژرف نگاہ اکابر اسلامی تعلیمات، اس کے مزاج و مذاق اور مقاصد شریعت کے سلسلہ میں خداداد بصیرت اور زہدوتقوی کی صفات سے مزین تھے۔ انھوں نے اس نظام میں شوریٰ کو وہی مقام دیا جس کی وہ مستحق تھی۔

یہی وجہ ہے کہ دارالعلوم کی تاریخ میں ایسا بھی نازک موقع آیا جب سرپرستِ دارالعلوم (حکیم الامت حضرت مولانا اشرف تھانوی رحمۃ اللہ علیہ) اور مجلسِ شوریٰ کے درمیان اس طرح کا مسئلہ پیش آیا اور دیانت وامانت کے اس عہد زریں میں اکابر نے عملی طور پر اس قضیہ کو اس طرح حل کر دیا کہ سرپرست نے شوریٰ کے سامنے اپنا استعفا پیش کر دیا جو شوریٰ کی بالادستی کے اعتراف کے ساتھ اختلاف کو ختم کرنے کا ایک نہایت کامیاب اور قابل تقلید حل تھا۔ کاش کہ اسی اعلیٰ نمونہ کی دیگر مواقع پر بھی پیروی کی گئی ہوتی تو دارالعلوم بہت بڑی آزمائش سے بچ گیا ہوتا، لیکن ماشاء الله كان وما لم يشأ لم يكن وهو الحكيم الخبير۔

دارالعلوم دیوبند کی تاریخ کے طالب علم کو صاف طور پر یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ دارالعلوم کی نمایاں خصوصیات میں دو چیزیں نہایت اہم ہیں؛ ایک دارالعلوم کا عوامی چندہ کا نظام قائم کرنا، اس کو مستحکم اور منظّم کرنا، دوسرے مدرسہ کو مجلس شوریٰ کے تحت قائم کرنا۔ حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے اصول ہشتگانہ میں بھی یہ دونوں خصوصیات بہت نمایاں طور پر نظر آتی ہیں۔ یہ دونوں عناصر دراصل تحریک مدارس کی روح ہیں اور ان بنیادوں میں کمزوری سے یہ نظام کمزوری اور لاقانونیت کی نذر ہو جائے گا۔ ان خصوصیات سے بانیان دارالعلوم کی دور بینی وژرف نگاہی کا بھی انکشاف ہوتا ہے کہ دنیا میں جمہوری دور کی آمد کی آہٹ انھوں نے کتنی پہلے محسوس کر لی تھی اور جمہوری بنیادوں پر اسلامی اداروں کو قائم کر کے دنیا کے سامنے بہترین نمونہ بھی پیش کر دیا تھا۔

شوری کا یہ نظام ہندوستان جیسے ملک میں مسلمانوں کے لیے کسی نعمتِ عظمی سے کم نہیں۔ یہ کتاب اہل مدارس کے لیے بہت کام کی ہے، اگر ارکانِ شوریٰ اور نظماء و مہتممین حضرات شرعی حدود میں رہ کر مدارس کے نظم ونسق کو چلائیں تو ان کے مابین ناگوار واقعات نہیں پیش آئیں گے۔ آج کے پرفتن اور ہوائے نفسانی کے غلبہ کے دور میں اداروں اور جماعتوں کو شخص واحد کی امارت وقیادت میں دینے اور بڑی بڑی جماعتوں اور عظیم الشان اداروں میں عملی طور پر وراثت کی روایت پڑنے کی صورت میں بااختیار اور ہیئت حاکمہ کی حیثیت رکھنے والی مجلس شوریٰ قیام اور اس کے ذریعہ طے شدہ ہدایات پر عمل بہت سے فتنوں اور مکروہات سے حفاظت کی ضمانت ہے۔

اگر چہ یہ کتاب ایک وقتی ضرورت اور عارضی حالات کے پس منظر میں لکھی گئی، لیکن اس کے مضامین مین بڑی آفاقیت اور وسعت ہے۔ یہ موضوع اس وقت جتنا اہم اور ضروری تھا، آج اس کی ضرورت واہمیت دو چند ہوگئی ہے؛ کیوں کہ ایک طرف مدارس کو خارجی فتنوں کا سامنا ہے اور دوسری طرف بہت سی داخلی کمزوریاں اس نظام میں در آئی ہیں:

فرد را ربط جماعت رحمت است	جوہر او را کمال از ملت است
تاتوانی با جماعت یار باش	رونقِ ہنگامۂ احرار باش
حرز جان کن گفتۂ خیر البشر	ہست شیطان از جماعت دور تر
فرد و قوم آئینۂ یک دیگر ند	سلک و گوہر کہکشان و اخترند
فرد می گیرد ز ملت احترام	ملت از افراد می یابد نظام

(رموز بے خودی، علامہ اقبالؒ)

☆☆☆